مہکتے بَرگد

جناب ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے انتہائی معتمد اور دیرینہ ساتھی
ملک خورشید احمد صاحب کی یاد میں

تحریر و تحقیق: ڈاکٹر عمران وحید ☆

اُمتِ مسلمہ میں ہر دور میں ایسے علماء اور مفسّرین پیدا ہوتے رہے ہیں جن کی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں، لیکن برصغیر پاک و ہند میں بعض علماء کی طرف سے یہ تاثر دیا جاتا رہا ہے کہ قرآن پڑھنا اور اس کے مفاہیم اور مطالب میں غور و فکر کرنا دراصل علماء کا کام ہے اور عوام الناس کو براہِ راست قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے لازمی طور پر کسی نہ کسی عالم سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ مزید یہ کہ بعض علماء نے ایک عام آدمی پر قرآن حکیم کو سمجھ کر پڑھنے کے لیے پندرہ علوم کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہے کہ ان کے بغیر قرآن کو سمجھنا ناممکن ہے۔ وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مَن مانی تاویلیں کر کے انسان گمراہ ہوسکتا ہے۔ متشابہات القرآن کی حد تک تو یہ بات کسی حد تک تسلیم کی جاسکتی ہے لیکن قرآن کے اوامر و نواہی اور اس کے آفاقی پیغام کو سمجھنے اور اس پر غور و فکر کرنے کے لیے ایک عامی مسلمان، جو اردو زبان سے واقفیت رکھتا ہو، پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کا اردو ترجمہ خود پڑھے اور اس میں غور و فکر بھی کرے تاکہ وہ جان سکے کہ اللہ مالک الملک نے اپنے کلام میں کیا ارشاد فرمایا ہے۔ جہاں مشکل مقامات آئیں تو وہاں کسی عالمِ دین سے راہنمائی لے لیں، لیکن قرآن کا سادہ اردو ترجمہ پڑھنا اور سیکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے اور اس کے لیے کسی استاد کی ضرورت نہیں۔

یہ تھی وہ فکر اور سوچ جس کو لے کر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ میدان میں آئے اور قرآن کا خادم ہونے کا حقیقی معنوں میں حق ادا کر کے اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب کا شمار ان خوش نصیب افراد میں ہوتا ہے جو اپنے لگائے ہوئے پودوں کو قدآور درخت بنتے اور پھلوں سے لبریز ہوتے ہوئے خود اپنی زندگی میں دیکھ لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بغیر کسی مسلکی تعصب کے قرآن مجید کے ترجمہ اور مختصر تفسیر کا جو کارنامہ انجام دیا اس کے باعث قرآن حکیم کا ترجمہ و مختصر تفسیر نہ صرف اردو بلکہ انگریزی زبان میں ویڈیو سی ڈیز کی شکل میں تمام دنیا میں پھیل گیا۔ میرا ذاتی موقف یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان سارا سال نہ سہی صرف رمضان کے مہینے میں ہی ڈاکٹر صاحب کا ''بیان القرآن'' آڈیو یا ویڈیو دو اڑھائی گھنٹہ روزانہ سن لے تو، ان شاء اللہ، وہ ختم قرآن کی سعادت بھی حاصل کر لے گا اور اس کی قرآن کے بنیادی پیغام تک اتنی رسائی حاصل ہو جائے گی کہ وہ قرآن حکیم کو سمجھ کر اس پر عمل کر سکے گا۔

اس مختصر تمہید کے بعد ہم زیرِ نظر مضمون کی طرف آتے ہیں جو ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ کے دیرینہ دوست ملک خورشید احمد صاحب کے بارے میں ہے۔ یہ صاحب ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے بھتیجے اور میرے ماموں تھے۔ ان کے ساتھ ہی میری ڈاکٹر صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر رفیع الدین اور علامہ اقبال سے بے حد متاثر

☆ اسسٹنٹ پروفیسر کارڈیالوجی، پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی، لاہور

تھے اور اپنی کتابوں اور تقاریر میں ان کے حوالہ جات کثرت سے دیا کرتے تھے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب ملک خورشید احمد صاحب کا نہ صرف بے حد احترام کرتے تھے بلکہ ان سے مشاورت بھی کرتے رہتے تھے۔ یہ سلسلہ ڈاکٹر صاحب کی وفات تک جاری رہا۔ ملک صاحب کو دین کی طرف راغب کرنے والی ہستی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تھی اور مجھے دینی علوم کی طرف ملک صاحب نے مائل کیا' گویا میرا قرآن وحدیث کی طرف آنا بھی دراصل ڈاکٹر صاحب ہی کی شخصیت اور تعلیم کے باعث تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی میرے ساتھ خصوصی محبت ڈاکٹر رفیع الدین کا نواسہ ہونے کے باعث تھی۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب پہلی مرتبہ میں نے ڈاکٹر صاحب سے اپنا تعارف ڈاکٹر رفیع الدین کے حوالے سے کرایا تو وہ بے حد شفقت سے پیش آئے اور میرا ہاتھ چوم لیا۔

آیئے اب اس ہستی کے حالات کا مطالعہ کریں جس کے بارے میں یہ مضمون ان کی وفات پر لکھا گیا تھا۔ اس مضمون کی تیاری میں ڈاکٹر صاحب کی کتب سے بھی راہنمائی لی گئی ہے جس میں ملک صاحب کا تذکرہ موجود ہے۔

لوگ یا تو اپنی عبادت گزاری اور زہد وتقویٰ کی بنیاد پر یا پھر خدمت خلق کے باعث موت کے بعد بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ بہت کم افراد ایسے ہوتے ہیں جو حقوق العباد اور حقوق اللہ کے معاملہ میں ایسا رویہ رکھیں کہ ان کی موت سے نہ صرف دنیا ایک متقی انسان سے محروم ہو جائے بلکہ لوگوں کے دلوں میں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی یاد باقی رہ جائے۔ زیر نظر مضمون ایک ایسے ہی خادمِ خلق اور ولی اللہ ملک خورشید احمد صاحب کی زندگی کی روداد ہے جس نے اپنی زندگی اللہ کی عبادت اور دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ یہ تحریر مرحوم کی وفات پر لکھی گئی تھی اور آج ان کی وفات کے ساڑھے تین سال بعد قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے' تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ دنیا اور دین ساتھ ساتھ کس طرح زندگی کا معمول بن سکتے ہیں۔

رات کے سات بجے ہیں اور میں ساہیوال کے علاقے کوٹ الٰہ دین نمبر ۲ میں ۱۷ مارچ کا سارا دن گزارنے کے بعد تیز رفتار سے سڑک پر دوڑتی ہوئی اپنی کار میں لاہور جا رہا ہوں۔ مطلع ابر آلود ہے اور اندھیرا چھا جانے کے باوجود سفید بادل آسمان پر پھیل چکے ہیں۔ میں کار کا شیشہ کھول کر بادلوں میں گھور رہا ہوں اور اُس کو تلاش کر رہا ہوں جس کو آج اپنے ہی ہاتھوں سے منوں مٹی تلے دفنا آیا ہوں۔ بادلوں کی اوٹ سے چاند بھی گاہے گاہے جھانکتا ہے اور میری اُمید بھری نگاہیں اُن دو آنکھوں کو تلاش کر رہی ہیں جن سے ہمیشہ مجھ پر محبتیں اور شفقتیں برستی رہی تھیں۔ بہت دیر تک بادلوں اور چاند کی آنکھ مچولی میں اُس ہستی کو تلاش کرنے کے بعد اچانک گاڑی کا ہارن بجنے سے جب مجھے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ میری یہ تلاش عبث اور نا تمام ہی رہے گی' اور اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں شاد عظیم آبادی کے شعر کا پہلا مصرعہ گونجنے لگا ع ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں' ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم!

میں یہ تو نہیں جانتا کہ لوگ اپنی یا اُن کے مرنے کے بعد دوسرے اُن کی سوانح عمری اور حالاتِ زندگی کیوں لکھا کرتے ہیں' لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اکثر اوقات یہ معاملہ ایسے افراد کے ساتھ ہی پیش آتا ہے جو کوئی بڑا کارنامہ انجام دے جائیں یا پھر کسی بڑے عہدے پر فائز ہوں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن افراد کی سوانح حیات اور زندگی کی روداد قلمبند نہیں کی جاتی کیا وہ واقعی اِس لائق نہیں ہوتے یا پھر ہمارے معاشرے میں ایسے عظیم لوگ ہمیشہ گمنام ہی رہ جاتے ہیں' کیونکہ وہ کسی ایسے مقصد کی خاطر زندگی گزار کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جاتے ہیں جو مادہ پرستی میں گھری ہوئی اس دنیا کے نزدیک کوئی وقعت ہی نہیں رکھتا۔ آج جس ہستی کا تذکرہ ہم کرنے جا رہے ہیں وہ واقعی ایک خادمِ خلق' پیکر محبت و وفا' صابر و شاکر اور نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔

حالاتِ زندگی

ملک خورشید احمد صاحب ۱۹۲۳ء میں کوٹلی لوہاراں مشرقی، ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد محترم کا نام پروفیسر نصیرالدین تھا جو معروف فلاسفر اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر رفیع الدین کے بھائی تھے۔ پروفیسر نصیرالدین مرے کالج سیالکوٹ میں پروفیسر تھے۔ ملک خورشید صاحب نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی اور بعدازاں اپنے والد کے ہمراہ ریاست جموں (ہندوستان) چلے گئے جہاں تقسیم ہند تک قیام کیا۔ جموں کے قیام کی یادیں اُن کی زندگی کا بیش قیمت سرمایہ تھیں اور راقم الحروف کو وہ اکثر وہاں کے واقعات سنایا کرتے تھے۔ جموں میں اپنے قیام کے دوران ہی ملک خورشید صاحب نے پرنس آف ویلز کالج جموں سے گریجویشن کیا۔ اُس دور میں اُن کے کلاس فیلوز میں معروف بیوروکریٹ جناب قدرت اللہ شہاب شامل ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد مہاجر ہوکر اپنے والدین کے ساتھ سیالکوٹ آ گئے اور وہیں رہائش اختیار کر لی۔ ملک خورشید صاحب کو سیالکوٹ آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی اُس وقت کے گورنمنٹ کالج منٹگمری (موجودہ ساہیوال شہر) میں لائبریرین کی ملازمت مل گئی۔ بعدازاں تمام عمر یہیں بسر کر کے ۱۷ مارچ ۲۰۱۴ء کو ساہیوال ہی میں وفات پائی۔ یہ ایک بہت طویل قیام تھا جس کے اُن کی زندگی پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ آپ نے ایم اے لائبریری سائنس بھی کر لیا تھا اور آپ نے یہ تعلیم بڑی مشقت اور تگ ودو سے حاصل کی تھی۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال کے کالج میگزین (ساہیوال) کے گولڈن جوبلی نمبر میں شائع ہونے والے ملک خورشید احمد صاحب کے ایک خودنوشت مضمون ''میری چند یادداشتیں'' میں ملک صاحب لکھتے ہیں:

> ''جموں ریاست کشمیر کے ایک خوبصورت شہر سے ہجرت کے بعد سیالکوٹ پہنچا۔ لاہور سول سروس اکیڈمی کی تین سال ملازمت کے بعد گورنمنٹ کالج منٹگمری میں بطور لائبریرین تعیناتی ہوئی۔ چونکہ یہ اپنی پسند کا شعبہ تھا' بڑی خوشی سے سفر کی تیاری شروع کی۔ ۲۶ مئی ۱۹۵۲ء کو عازمِ منٹگمری ہوا۔ ٹرین اور بس کا سفر پانچ سے سات گھنٹے کا ہوا کرتا تھا اور بہت کم سواری دستیاب ہوتی تھی۔''

ملک صاحب بطورِ خادمِ خلق

ملک خورشید احمد صاحب کا تذکرہ کسی عام انسان کا ذکر نہیں بلکہ ایک نابغۂ روزگار' خدا ترس اور شفیق انسان کی روداد ہے' جس کو عوام الناس کے لیے بیان کرنا اُن سے نہ صرف میری محبت کا تقاضا ہے بلکہ یہ مجھ پر اُن کا بہت بڑا قرض ہے۔ راقم الحروف کو وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ: ''میرا کوئی بیٹا نہیں ہے' تم ہی میرے بیٹے ہو''۔ اِس لیے اُن کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا جائزہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں تا کہ خدمت خلق اور زہد وعبادت کے اِس عظیم پیکر کے حالات پڑھ کر لوگ اپنی اصلاح بھی کر لیں اور ایک بے لوث اور مخلص انسان سے آشنا بھی ہو جائیں۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جس کی ایک ایک سانس غرباء' مساکین' حاجت مندوں اور بے سہارا لوگوں کے لیے وقف تھی۔ کوئی بھوکا ہو' بیمار ہو' مجبور ہو یا پھر لاچار اور پریشان ہو' ساہیوال کے کوٹ الٰہ دین نمبر ۲ میں اُن کا گھر اُس کے لیے بے حسی اور خودغرضی کی اِس اندھیری رات میں مدد کی امید کا ایک روشن مینار تھا جس کی روشنی دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ صورت حال یہ تھی کہ ضرورت مند پروانوں کی طرح اِس شمع کی کرنوں پر ٹوٹ پڑتے تھے اور اپنا مقصد حاصل کر لیا کرتے تھے۔ کیا عجیب بات تھی کہ اُن کے اپنے مالی حالات اتنے اچھے نہیں تھے اور نہ ہی ان کی زندگی کسی قسم کے ناز ونعم سے عبارت تھی۔ سادہ غذا اور لباس' نہ کوئی گلہ اور نہ شکوہ۔ جو مل گیا اُسی کو مقدر سمجھ لیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ اِس کے باوجود اُن کے پاس مخیّر حضرات کے دیے ہوئے لاکھوں روپے ہوتے تھے جو لوگ اُنہیں اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک سے بھیجا کرتے تھے اور پورے اعتبار

اور اعتماد کے ساتھ اُن کے حوالے کیا کرتے تھے' کیونکہ وہ بخوبی یہ بات جانتے تھے کہ اُن کی یہ رقم مستحق افراد میں تقسیم ہو گی۔ ملک خورشید احمد صاحب کے پاس جو لاکھوں روپے صدقات' زکوٰۃ وغیرہ کی مد میں جمع ہوتے تھے' وہ اُنہیں ایک نہایت مربوط اور منظّم شیڈیول کے مطابق ماہانہ بنیادوں پر مستحق' نادار اور بے سہارا انسانوں میں تقسیم کرتے اور اِس کا مکمل ریکارڈ ایک ڈائری میں رکھا کرتے تھے۔ اُن کی خواہش یہ ہوا کرتی تھی کہ یہ لاکھوں روپے زیادہ سے زیادہ محتاجوں کی مدد کے لیے استعمال کیے جائیں' نہ کہ کسی ایک شخص کو بہت سی رقم دے کر باقیوں کو محروم کر دیا جائے۔ کسی کو آٹا' گندم' چاول' اناج ماہانہ بنیادوں پر فراہم کیا جاتا اور کسی کی دکان میں سودا ڈلواتے' بیماروں کو خود ادویات خرید کر دیتے اور نادار مریضوں کے علاج کے لیے خود جاتے یا فون پر ڈاکٹروں سے رابطہ کرتے اور ہسپتالوں میں بھیجنے سے پہلے مریض کو اپنا رقعہ اور حوالہ دے کر روانہ کرتے اور اِس بات کو یقینی بناتے کہ مالی وسائل کی کمی کے باعث کوئی علاج معالجے سے محروم نہ رہ جائے۔ اُن کے دال روٹی والے سادہ سے دسترخوان میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت اور وسعت نصیب فرمائی تھی۔ شاید اسی وجہ سے میں نے ان کے گھر میں غریب اور بھوکے مردوں' عورتوں اور بچوں کی ایک کثیر تعداد کو ہمیشہ اور مستقل بنیادوں پر باقاعدگی سے کھانا کھاتے دیکھا تھا اور یہ سلسلہ اُن کی زندگی کے آخری دن تک جاری وساری رہا۔ ساہیوال کے لوگ ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں عبدالستار ایدھی کے لقب سے نواز چکے تھے۔

بطورِ مستجابُ الدعوات بزرگ

ملک خورشید احمد صاحب کی شخصیت کا یہ گوشہ اکثر لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہا ہوگا' کیونکہ اُن کی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کرنے والے افراد ہی اِن باتوں کو جانتے ہیں۔ میں یہاں صرف اپنے چند مشاہدات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان واقعات کے بیان کرنے کا مقصد کسی کی پیری اور ولایت کی دھاک بٹھانا ہرگز نہیں بلکہ قارئین کو یہ باور کروانا ہے کہ جو لوگ اللہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ دُکھی انسانیت کی خدمت کو اپنا شعار بناتے ہیں اُن سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جاتے ہیں اور اُن کی دعائیں ان کے اور دوسروں کے حق میں قبول فرماتے ہیں۔ ذیل میں میرے چند ذاتی مشاہدات پیش خدمت ہیں:

ملک خورشید احمد صاحب کی وفات سے چار روز قبل ۱۳ مارچ کو مجھے اُن کا فون آیا اور اُنہوں نے فون نہ کرنے اور حال نہ پوچھنے کا گلہ کیا۔ میں نے اُن کو بتایا کہ مجھے شدید بخار تھا جس کی وجہ سے میں رابطہ نہ کر سکا۔ اُنہوں نے کہا کہ تم فکر مت کرو' میں اللہ سے دعا کروں گا' وہ میری دعائیں سنتا اور قبول کرتا ہے۔ ۱۴ مارچ کی صبح جب میں اُٹھا تو میرا بخار ٹوٹ چکا تھا۔ جب میں دفتر پہنچا تو ملک صاحب کا فون آیا جس کا انداز یہ تھا: مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارا بخار اُتر گیا ہوگا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور اُن کو بے شمار دعائیں دیں۔

اسی طرح ۱۹۹۵ء میں جون کے مہینے کی ایک گرم دوپہر کو اُنہوں نے ساہیوال جانا تھا۔ آسمان سے آگ اور لو برس رہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگے کہ میں بس یا لاری پر نہیں جانا چاہتا۔ وضو کیا اور دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی کہ یا اللہ! میرے لیے کسی گاڑی کا بندوبست فرما دے' میرے مالک! میں ویگن یا لاری پر نہیں جانا چاہتا۔ میں اُن کے قریب بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ باہر گھنٹی بجی۔ میں نے باہر جا کر دیکھا تو ایک صاحب میرے والد صاحب سے ملنے آئے تھے اور اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ساہیوال سے آیا تھا تو سوچا کہ ڈاکٹر صاحب کو سلام کرتا جاؤں۔ وہ واپس جانے کے لیے گاڑی کی طرف بڑھے تو اچانک خورشید صاحب باہر آ گئے اور بولے: ''بیٹا! اللہ نے تمہیں میرے لیے بھیجا تھا' مجھے ساتھ لیتے جاؤ!'' یوں ان کی دعا قبول ہوئی اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر ساہیوال چلے گئے۔

ایک اور ناقابل فراموش واقعہ اُس وقت پیش آیا جب اُن کی بڑی بیٹی، جو راولپنڈی میں مقیم تھیں، شدید بیمار ہو گئیں اور جنرل ہسپتال میں زیر علاج تھیں۔ جسم میں خون کی شدید کمی کے باعث جان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ ملک صاحب مستقل دُعائیں مانگ رہے تھے۔ اُس دن میں نے جس طرح دُعاؤں کی فوری قبولیت ہوتے دیکھی ایسی اپنی زندگی میں آج تک دوبارہ نہیں دیکھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اُنہوں نے جو التجا بھی بارگاہِ ربّ العزت میں پیش کی وہ من وعن وسائل کی فراہمی کی شکل میں پوری ہوتی چلی گئی۔ اللہ کی مدد اور نصرت آن پہنچی اور اُن کی بیٹی بچ گئی۔ مجھ سے کہنے لگے: ''میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ اسے کچھ نہیں ہوگا!'' بے شک جو لوگ اللہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ خدمت خلق کو بھی اپنا شعار بنا لیتے ہیں وہی اللہ کے ولی ہوتے ہیں۔

گورنمنٹ کالج ساہیوال (منٹگمری) سے تعلق اور یادداشتیں

۱۹۹۲ء میں گورنمنٹ کالج ساہیوال کے میگزین کے شائع ہونے والے گولڈن جوبلی نمبر میں ملک خورشید احمد صاحب کا خودنوشت مضمون ''میری چند یادداشتیں'' شائع ہوا تھا جس میں آپ نے اپنے قلم سے اپنی یادوں کو تازہ کیا ہے۔ آج مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس مضمون کے چند اقتباسات بھی قارئین کی نذر کر دیے جائیں۔ اپنی ساہیوال آمد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''گیارہ بجے دن کالج پہنچا۔ کالج کی شاندار بلڈنگ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ لائبریری کی پچھلی جانب سائیکل سٹینڈ پر چوکیدار اللہ بخش کے پاس سامان رکھا اور لائبریری میں داخل ہوا۔ وہاں پروفیسر رضاء اللہ خان صاحب اور پروفیسر عبدالمالک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ رضاء اللہ خان صاحب لائبریری انچارج تھے۔ فوراً ملک منصب کی کنٹین سے مینگو سکویش اور کیک پیس منگوائے گئے۔ آج بیالیس سال گزرنے کے باوجود مجھے اس خلوص اور پیار سے پلائے گئے سکویش اور کھلائے گئے کیک پیس کا مزہ یاد ہے۔ میں سفر کی تمام کوفت اور تھکان ان دو اصحاب کے پیار اور خلوص کی وجہ سے قطعی بھول گیا۔ یہاں سکندر علی بھٹی کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ یہ اُس وقت لائبریری کلرک تھے اور باوجود اس حقیقت کے کہ میرے آنے سے ان کو نوکری سے جواب ہو سکتا تھا (اللہ کا شکر ہے کہ ایسا نہ ہوا) اپنے فطری خلوص، پیار اور محبت کو نہ دبا سکے۔

اتنی دیر میں پروفیسر نذیر احمد بھلی صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ایک جانی پہچانی شخصیت میسر آ گئی۔ بھلی صاحب مجھ سے تین سال سینئر تھے اور پرنس آف ویلز کالج جموں کے ہونہار طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ قدرت اللہ شہاب بھی اسی کالج کے گریجوایٹ تھے۔ بھلی صاحب اور عزیزم سکندر بھٹی نے میری رہائش اور کھانے کا مسئلہ حل کر دیا۔ (یہ دونوں حضرات وفات پا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، آمین!)''

کالج کے پرنسپل میاں اصغر علی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جناب پرنسپل میاں اصغر علی صاحب کے پرنسپل بن کر آنے سے کالج نے بہت ترقی کی اور وہ بلاشبہ ایک سنہری دور تھا۔ کالج تمام شعبوں میں اُس وقت عروج پر تھا۔ لائبریری میں انقلابی اقدام کیے گئے۔ ریڈنگ روم کو بہترین فرنیچر اور ساز و سامان سے مزیّن کیا، حوالہ جاتی کتب اور تمام رسائل کے تازہ شمارے رکھے گئے۔ ریڈنگ روم میں اتنا رش ہو گیا کہ ہم یہ سوچنے لگے کہ کرسیوں کی ایک اور قطار لگا دی جائے۔ شاید یہ واحد ادارہ تھا جہاں کالج لائبریری کے اوقات کار صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک کر دیے گئے اور یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔''

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''میں یہاں یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے جو آغاز میں فیصلہ کیا تھا کہ یہاں سے ٹرانسفر کروا کر کسی بہتر

جگہ چلا جاؤں گا تو وقت کے ساتھ ساتھ یہ احساس بڑھتا چلا گیا کہ ساہیوال سے بہتر جگہ دنیا کے کسی خطے میں نہیں۔ یقین کریں اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ کالج کا ماحول شروع سے آخر تک ایسا رہا کہ جیسے یہ ہمارا گھر ہے اور ہم سب ایک کنبہ کے افراد ہیں۔ ایک دوسرے سے ہمارا واقعتاً تعلق ایسا ہے کہ خونی رشتہ بھی کیا ہوگا۔ مجھے اس وقت بہت سے باتیں یاد آ رہی ہیں۔ اگر ان کو لکھنا شروع کروں تو ختم نہ ہوں۔''

آخر میں لکھا ہے:

''میں ۱۹۸۴ء میں کالج سے ریٹائر ہوا۔ ساہیوال میں پبلک لائبریری نہ تھی۔ میری انتہائی خواہش تھی کہ یہاں پبلک لائبریری قائم ہو۔ چودھری ممتاز حسین، جن سے کالج کی وجہ سے تعلق تھا اُنہوں نے میری خواہش کو پذیرائی بخشی اور بحیثیت وزیر تعلیم و مالیات ایک شاندار لائبریری کے قیام کا حکم نامہ جاری کیا۔''

مذکورہ لائبریری کا نام جناح پبلک لائبریری ہے اور ملک خورشید احمد صاحب ہی اس کے بانی لائبریرین بھی تھے۔ ۱۹۸۴ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد ایک طویل عرصہ تک ملک صاحب اس لائبریری سے منسلک رہے اور اس ادارے نے اُن کی نگرانی میں خوب ترقی کی۔

ڈاکٹر رفیع الدین اور ڈاکٹر اسرار احمد سے تعلقات اور اقبالیات

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نہ صرف برصغیر بلکہ بین الاقوامی سطح کی ایک انتہائی معروف اور بلند پایہ شخصیت تھے اور رشتے میں ملک خورشید احمد صاحب کے چچا تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ڈاکٹر رفیع الدین کو اقبال اکیڈمی کا پہلا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ ملک خورشید احمد صاحب نے مجھے ڈاکٹر رفیع الدین، Bertrand Russel اور علامہ اقبال کے بارے میں کئی نادر معلومات فراہم کیں جو کتب میں موجود نہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے بارے میں اُنہوں نے بتایا کہ وہ Bertrand Russel اور ES Brightman جیسے بین الاقوامی اور رادھا کرشنن جیسے مقامی فلاسفروں کے ہم پلّہ فلاسفر اور سکالر تھے۔ خورشید احمد صاحب نے یہ بھی بتایا کہ Bertrand Russel کے آخری عمر کے چند نہایت اہم خطوط، جو اُنہوں نے ڈاکٹر رفیع الدین کے نام لکھے تھے، ان کی شخصیت کے نہاں گوشوں کے بارے میں نہایت نادر معلومات فراہم کرتے ہیں، جن میں Bertrand Russel نے اسلام سے گہری دلچسپی کا بھی اظہار کیا تھا اور یہ خطوط ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے ملک صاحب مرحوم کو دکھائے بھی تھے۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی شخصیت کے حوالے سے ایک مرتبہ مجھے ملک خورشید صاحب کے ہمراہ معروف مذہبی سکالر جناب ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کے گھر جانے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ملک صاحب کو قرآن اکیڈمی مدعو کیا تھا اور میں اُن کے ساتھ تھا۔ چونکہ ملک صاحب ڈاکٹر رفیع الدین کے بھتیجے تھے اِس لیے ڈاکٹر اسرار احمد اس حوالے سے چند معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ راقم الحروف اُس وقت کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں سالِ دوم کا طالب علم تھا اور ہاسٹل میں رہائش پذیر تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد اور ملک صاحب کی اقبالیات کے بارے میں جو باتیں اُس دن میں نے سنی اُن سے مجھے اندازہ ہوا کہ ملک خورشید صاحب اقبالیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔

اقبالیات کے حوالے سے میں اُن کے ساتھ ۱۹۹۲ء میں پروفیسر محمد منور مرزا صاحب کی دعوت پر اقبال اکیڈمی گیا اور اُن سے ملاقات کی۔ وہ ملک خورشید احمد صاحب سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اُنہوں نے بھی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی طرح ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے حوالے سے ملک صاحب کی بہت قدر کی۔ اُسی روز میں اقبال اکیڈمی کا رُکن بنا اور یہ رکنیت آج بھی قائم ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے ان کا رابطہ ہمیشہ کسی نہ کسی صورت قائم رہا۔ جب بھی لاہور آتے تو ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ضرور کرتے اور ڈاکٹر صاحب بھی ان کا خوب احترام اور حتی المقدور خاطر تواضع کرتے۔

راقم الحروف سے ذاتی مراسم

رشتے کے اعتبار سے ملک خورشید صاحب یوں تو میرے ماموں تھے' لیکن یہاں میں یہ اعتراف کرنا لازم جانتا ہوں کہ میری شخصیت پر تربیت کے حوالے سے جتنے احسانات ملک صاحب کے ہیں وہ کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔ بچپن سے لے کر آج تک میرے اندر اخلاقی' مذہبی اور انسانی حوالے سے اگر کوئی اچھی اور عمدہ بات موجود ہے تو وہ اُنہی کی ذات کے مرہونِ منت ہے۔ ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ وہ میرے بہترین دوست' غم گسار' ہمدم اور مستقل رہنما بھی تھے۔ یہاں یہ ضرور بتانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۷۸ء کی ایک رات والدہ کی اچانک اور ناگہانی موت نے میری دس برس کی شخصیت اور زندگی کا رُخ یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ مزاج میں زبردست تغیرات جنم لینے لگے تھے۔ چنانچہ اس حادثے کے بعد ملک صاحب باقاعدگی سے ہمارے گھر آنے لگے اور میری تربیت کا اُنہوں نے خصوصی خیال رکھا۔ والدہ کی وفات پر اُن کے الفاظ مجھے آج بھی یاد ہیں جب اُنہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری ماں میری بڑی پیاری بہن تھی اور تم اس کے بچے ہو اور میرے پاس میری بہن کی نشانی ہو۔ والدہ کی وفات کے بعد اُن کی محبت اور شفقت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اُنہوں نے مجھے مسجد کا راستہ دکھایا' وہی مجھے قرآنِ حکیم کی دعوت سے روشناس کرواتے رہے اور یہ کام میری دس گیارہ برس کی عمر سے شروع ہو کر میرے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے زمانے تک جاری رہا۔ اُنہوں نے میرا اُس وقت تک تعاقب کرنا نہ چھوڑا جب تک میں نے قرآن مجید اور دورۂ حدیث مکمل نہ کر لیا۔ کم سنی میں جن بچوں کے والدین میں سے کسی ایک کی اگر موت واقع ہو جائے تو اُن کی شخصیت عدمِ اعتماد کے باعث ادھوری رہ جاتی ہے' لیکن آفرین ہے ملک خورشید صاحب پر کہ اُن کی رہنمائی اور تربیت سے میں نے نہ صرف اپنے ہم عصروں میں سب سے بہترین تعلیم حاصل کی بلکہ اُن کے ہر ہفتے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں میرے پاس آنے کے باعث کئی تقریری مقابلوں میں حصہ لیا اور میرے کئی مضامین کالج میگزین کی زینت بنے۔ والدہ کی وفات سے لے کر اور بعد ازاں جب خاندانی نظام ایک بری طرح کی ناہمواری' ٹوٹ پھوٹ اور مصنوعی جوڑ توڑ کا شکار ہونے لگا تو ملک صاحب ہی وہ ہستی تھے جنہوں نے میرے اندر جنم لینے والی بغاوتوں کو کچل کر مجھے بعض انتہائی خوفناک انتقامی اقدامات سے بچا لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے' آمین۔ مختصر یہ کہ اگر میں یہ کہوں کہ ملک خورشید صاحب نے میرے روحانی باپ کا کردار ادا کیا تو یہ غلط نہ ہو گا۔ زندگی کا کوئی مشکل سے مشکل مسئلہ ہی کیوں نہ ہو اُنہوں نے اُس کا بہترین حل سجھایا۔ مسائل آج بھی موجود ہیں اور جب بھی کوئی مشکل پیش آتی ہے تو ملک صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ؎

یادیں ترے خلوص کی ڈستی ہیں آج بھی — ملنے کی آرزوئیں ترستی ہیں آج بھی
آنکھیں ہزار صبر کی کوشش کے باوجود — رُک رُک کے بار بار برستی ہیں آج بھی

آخری ایّام' وفات اور چند یادیں

ملک خورشید احمد صاحب کی زندگی کے آخری تین برس کمزوری اور گھٹتی بڑھتی بیماری میں گزرے۔ آخری سال میں سفر کا سلسلہ بالکل ختم ہو گیا تھا اور لاہور آنا جانا جو پہلے اُن کا معمول تھا' وہ بھی باقی نہ رہا اور کمزوری نے کوٹ الٰہ دین نمبر۲ ساہیوال تک محدود کر دیا تھا۔ چنانچہ میں ہی اِن برسوں میں تین مرتبہ اُن سے ملنے ساہیوال گیا۔ اِس تمام بیماری اور تکلیف کے باوجود خلق خدا کی خدمت' بھوکوں اور ناداروں کی مدد' غرباء اور مساکین کی خبر گیری اُسی طرح جاری و ساری رہی۔ اکثر کسی نہ کسی غریب مریض کے لیے مجھے فون کرتے تھے اور علاج معالجے کے لیے ہر ممکن تعاون کی ہدایات جاری

کیا کرتے تھے۔ یہی غرباء، مساکین اور محتاجوں کی دادرسی اُن کی زندگی کے آخری دن تک جاری وساری رہی۔ ۱۶ مارچ ۲۰۱۴ء کی شام کو گرنے کے باعث سر پر چوٹ لگی۔ ڈاکٹر کی تجویز کردہ ادویات سے جب کچھ بہتری پیدا ہوئی تو رات دس بجے کے بعد سونے کے لیے بستر پر لیٹ گئے۔ اِس کے بعد نیند آ گئی اور سو گئے اور ۱۷ مارچ ۲۰۱۴ء کو نصف شب بغیر کسی کو تکلیف میں مبتلا کیے نہ جانے کس وقت حالت نیند ہی میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اُن کے چہرے پر موت کی اذیت کے کوئی آثار نہ تھے بلکہ ایک ایسا سکون تھا جو بہت کم خوش نصیبوں کو نصیب ہوا کرتا ہے۔

آج ۱۷ مارچ کو جب اُن کی میت ان کے گھر میں رکھی ہوئی تھی تو مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی کی وہ حاجت مند اور غریب افراد جن کو آج کا ٹائم دیا ہوا تھا وہ ملک صاحب کے دروازے پر کھڑے تھے، لیکن اُنہیں کیا خبر تھی کہ آج اُنہیں نامراد ہی لوٹنا پڑے گا، کیونکہ اُن کا مسیحا، غم گسار اور دُکھوں کا بانٹنے والا ابدی نیند سو گیا تھا۔ یوں تو ملک خورشید صاحب کے جنازے میں ڈاکٹرز، انجینئرز، وکلاء اور پروفیسرز سب موجود تھے، لیکن قابل غور بات یہ تھی کہ غریب بچے، عورتیں اور بوڑھے افراد کی ایک کثیر تعداد بھی اشک بار آنکھوں کے ساتھ جنازے کے ساتھ موجود تھی۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے ملک خورشید صاحب کی وہ بات یاد آ گئی جو وہ اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے کہ اگر میرے جنازے پر کوئی بھی نہ آیا اور کوٹ الٰہ دین کے یہ غریب لوگ مجھے اُٹھا کر قبرستان لے گئے اور دعاؤں کے ساتھ دفنا دیا تو میں یہ سمجھوں گا کہ زندگی کامیابی اور کامرانی سے گزر گئی اور آخرت بھی سنور گئی۔

آج ملک خورشید صاحب کو کوٹ الٰہ دین نمبر ۲ ساہیوال کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا تھا اور میں تدفین سے فارغ ہو کر لاہور واپس آ رہا تھا اور جیسا کہ مضمون کے آغاز میں ذکر کر چکا ہوں، آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں ملک صاحب کو تلاش کرتا ہوا تھک ہار کر آنکھیں بند کر کے گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک گاڑی کے رُکنے سے آنکھ کھل گئی اور والد صاحب نے بتایا کہ گھر آ گیا ہے۔ میں نے آسمان میں گھور کر جب ملک خورشید صاحب کو پکارا تو بار بار ایک ہی آواز سنائی دے رہی تھی جو کہیں دُور سے آ رہی تھی۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم!

آخر میں اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا ہے کہ وہ ملک خورشید صاحب کی مغفرت فرمائے اور بر بنائے تقاضائے بشری اُن سے جو خطائیں ہوئیں وہ اپنی رحمت سے معاف فرما دے اور اُن کے اعمالِ صالحہ کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما لے۔ اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دُعا ہے کہ وہ ملک صاحب کی قبر کو نور سے منور فرما دے، جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنا دے اور اُنہیں قبر اور آگ کے عذاب سے محفوظ فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ آمین، ثم آمین، یاربّ العالمین!

مثل ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا — نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے — سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

نوٹ: زیرِ نظر مضمون میں تمام نجی اور ذاتی نوعیت کی معلومات ملک خورشید احمد صاحب کی صاحبزادی محترمہ پروفیسر حمیرا خورشید صاحبہ سے حاصل کی گئی ہیں۔ دیگر تمام معلومات اور حوالہ جات کے لیے میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ادارے قرآن اکیڈمی لاہور اور اقبال اکیڈمی لاہور کا مفید معلومات مہیا کرنے پر شکر گزار ہوں۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال کے ۱۹۹۲ء کے گولڈن جوبلی نمبر شمارے سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

❁❁❁